بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تناظُر

نظارگی مرے احوال کی ہے اور کہیں
یہاں تو بس مرے آثار کا تماشا ہے

تناظُر

شاہد ماکلی

اَعصار اکادمی

جملہ حقوق بحق شاعر محفوظ

تناظُر ____ غزلیں ____ شاہد ماکلی

ناشر

اَعصار اکادمی، مکوَل کلاں (تونسہ شریف)

رابطہ

Shahid Makli , P/O Makwal Kalan,
Tehsil Taunsa Sharif, D.G.Khan
0333-4419182
shahidmakli@hotmail.com
shahidmaklee@gmail.com

ضابطہ

کتاب	:	تناظُر
مصنف	:	شاہد ماکلی
اہتمامِ اشاعت	:	الاشراق، لاہور
اشاعتِ اوّل	:	اپریل 2014
قیمت	:	200 روپے

انتساب

خالد احمد کے لیے

عکسِ جمالِ مستقل، کھینچ کے رہ گئے خجل
ہم کہ یہاں تھے میہماں ایک دن ایک رات کے
(خالد احمد)

دیکھا بھی، دکھایا بھی، سنایا بھی، سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں، نہ خبر میں
(اقبال)

تناظُر

دمک اٹھے ہیں کئی منظر ایک ساتھ ہمارے — سعود عثمانی
تغزل بھرے سوالات — حسنین سحر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اور اب نگاہ اُسی آخری نشان پہ ہے
مرے ہی سانس کے بل پر فروغ پاتا ہوا
جُدا تھے کیمیادانوں سے کلّیات ہمارے
بڑھا جو سوزِ دُروں، آپ میں پگھل گیا مَیں
یہ قبل و بعد سے جو انحراف ہے میرا
خواب کا سلسلہ ہے اور کہیں
ایسی اَلم ناک تھی ہجر بیانی مری
چپ میں غنیمت ہوں مَیں، شور میں خمیازہ ہوں
نیند میں کھُلنے والے در کی خبر
یہ میں جو چھوڑی ہوئی رہ گزر تک آیا ہوں

اور اب تو اذنِ سفر بھی ہے، راستہ بھی ہے
جدھر بھی دیکھیے تکرار کا تماشا ہے
بظاہر اپنی ہی دُنیا سے رابطہ ہے مرا
آ گئی دل کو جگمگانے مرے
پہلے گریزاں تھا کیوں اِس طرف آنے سے مَیں
اک حدِّ لازماں تھی اور اُس پہ تھا گھر مرا
بہم ہوئے ہیں اب آ کر ابدازل دل میں
نہیں تھا کچھ بھی اگر کشش جہات سے باہر
کبھی جو رات کی منجدھار سے گزرنے لگا مَیں
پورا کھلتا نہ بند ہوتا ہوں
خاموشی میں ہُوا ہے نہ گفتار میں ہوا
کھُلتا ہی نہیں یہ کیا سفر ہے
نفَس نفَس نئے سانچے میں ڈھلتا رہتا ہوں
رکھا ہے سلسلہ تو ایک ذات سے مَیں نے
جانے اِس کھیل میں کیا باقی ہے، کیا فانی ہے
میں کیوں نہ اور کسی سَمت میں سفر کرتا
ہاں، لوٹ تو آئے گا وہ شب تک
منزل سے گریز پا کہاں ہے
تمنا سے جو خالی ہو گیا دل
دُور کے برگ و بر لیے پھرا مَیں
دِکھائی دیتے نہیں ہیں زمانے کیوں میرے
لہروں پہ تموج کا گماں ہے بھی نہیں بھی
نم گرفتہ تو ہو گی، شام جو ہے
دل منسلک ہے تیرے درِ خواب سے مرا
احوال کا گنجینہ، تب آپ تھے اب ہم ہیں

خود میں ہے کہیں سفر ہمارا
کہیں قیام اگر ہو مسافرانہ مرا
جب تک وہ میرے سامنے لاتا نہیں مجھے
میں جدھر ہوں اُدھر نہیں کوئی
ثباتِ نقش کے دعوے تھے سب غلط میرے
ابھی وہ روشنی ہمراہ تھی، ابھی دن تھا
میں اپنا آپ اُس گلی کے نام کر نہیں سکا
یہ جو تری بزم کی فضا ہے
کر دیا کس نے بے نقاب مجھے
اب اتنے دِن سے جو خود میں سکوت آسا ہوں
کہیں دریچہ دریچہ بہارا گر ہے بھی
دیر تک پاس بٹھاتا ہے مجھے
کسی کو عصر فروزی کا اب دماغ نہیں
شش جہت میں یوں ہے اپنا راستہ
پڑھی ہیں جس نے اساطیر عہدِ رفتہ کی
یہ ذوقِ دید مرے ساتھ اگر نہیں ہوگا
آتا ہے زد میں مری، اپنا کنارا مرا
سوچتے تھے، جائیں گے کون و مکاں سے کہاں
کچھ اِس لیے بھی زمانے سے ہم کو نسبت نئیں
میں اپنے دل میں، تو دُنیا میں غرق ہے بھائی
جو روح میں یہ ہری روشنی اُتر جائے
باہر کا تو راستہ وہی ہے
ہر ایک باب عجب تھا اور انتساب عجب
جگنو میں جیسے نور کبھی ہے کبھی نہیں
عمر کے البم میں تو ہر طرح کی تصویر ہے

فقط ہماری تصاویر ہی ادھوری نہیں
پہلے دروازہ کھلا، پھر گھر کھلا
فصیلیں بیچ میں حائل ہیں، آپ کیا جانیں
شام مجھ کو سحر کی طرف لے گئی
دن ہے قریب آخری لمحات کی قسم
پہلے سے بڑھ کر کہیں دہکنے لگا ہوں
کسی کشادہ فضا میں مہک رہا ہوتا
ضَو ریز ہوں چاہے جس قدر عکس
جو سنا ہے وہ سناتا ہوا ہو سکتا ہوں
اور اب جو مجھ میں بدن سے گریز پائی ہے
مسئلہ جو کہ بے سبب ہوگا
بیان خود کو کروں بے خودی کے پردے میں
سخت مشکل گھڑی کا سامنا ہے
سحر کی آس میں با چشمِ نم پڑے ہوئے ہیں
لایا ہوں مَیں ترے لیے تارے سجا کے طشت میں
جب سارا شہر خواب کی دُنیا میں محو تھا
وہ اک فضا جو نظر پار جھلملاتی تھی
جب اُس دیارِ نور سے رُخصت ہوا تھا میں
لامتی ہے صد جہات میری
میں اِس لیے ہجوم کا حصہ نہیں بنا

دَمک اٹھے ہیں کئی منظر ایک ساتھ ہمارے

شاہد ماکلی کے ہنر اور صبر کی داد دینی پڑتی ہے۔ کیا کمال شاعر ہے اور کیا کمال شخص ہے! صبر بھی اعلیٰ درجے کا۔ اِس شوریدہ سر کے نغموں اور نالوں نے اس کے سینے پر بخیہ کیا لیکن اس نے اپنی زمام اپنے ہاتھ میں رکھی۔ یہ کام اُس کے لیے اِس لیے زیادہ دشوار تھا کہ اب وہ شاعری میں جس جگہ ہے وہاں اپنے آپ پر اعتماد اور اپنے لکھے ہوئے پر اعتماد بنیادی شرط ہے۔ اور یہ دونوں شرائط شاہد بدرجہ اولیٰ پوری کرتا ہے۔ اتنا بھرپور، منفرد اور اعلیٰ کام کر کے اسے سنبھالے رکھنا کمال صبر کی دلیل ہے۔ یہ صبر، یہ تحمل، یہ ٹھہراؤ، یہ سکون، یہ قرار جو تدریجاً اُس کی شخصیت اور اُس کے مزاج میں نفوذ کرتا رہا ہے، دراصل اُس شاعری کی دین ہے جو شاہد کو بے قرار، بے صبر، بے تحمل اور بے سکون رکھتی ہے۔ جو آندھی میں اُسے ایک پتے کی طرح اُڑائے پھرتی ہے، جس کے جھکڑ اُس کے صحرا میں کبھی شمال سے جنوب اور کبھی مشرق سے مغرب کی جانب چلتے رہتے ہیں۔ یہ ہوائیں ریت کے ٹیلوں کو اِس طرح کچھ ساعتوں میں اِدھر سے اُدھر لا ڈالتی ہیں کہ وہی جانا پہچانا دشت پہچان میں نہیں آتا۔ اِس صحرا کی شکلیں ہر آندھی کے بعد تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی حدود نہیں بدلتیں لیکن یہ خود ہر بار بدل جاتا ہے۔ اس کے منظر بنفشی صبح، آتشی دوپہر، سرمئی اور زردگوں شام اور نقرئی خنک چاندنی رات سمیت، متنوع اور دل آویز ہیں۔

شاہد کا ہنر اپنی مثال آپ ہے۔ محض اِس لیے نہیں کہ وہ اعلیٰ غزل گو شعرا کی پہلی صف میں شامل ہے بلکہ اِس لیے بھی کہ اس نے اپنی شاعری کو اپنی شخصیت کی بازیافت کے لیے اختیار کیا، اور اپنی شخصیت کو اپنی شاعری کی دریافت کے لیے استعمال کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا خود سے تعارف اس کی شاعری ہی نے کرایا ہوگا اور پھر وہ اپنا اور اپنی دنیاؤں کا ہو کے رہ گیا۔ اس کے اندر ایک الاؤ لپٹیں مارتا ہے جس کی شعلگی کو وہ بہترین جمالیاتی شعور کے ساتھ الفاظ میں تجسیم کرتا ہے۔ وہ روشنی چکھتا ہے اور

دریائے رواں سے مکالمہ کرتا ہے۔ ستاروں سے کلام کرتا اور آنکھ موند کر ایک خواب کی دوری کو عبور کرتا ہے۔ یہ جس بے قرار طمانیت اور سرگرداں سکون کی بات ہے، شاہد اُسے خود جانتا ہے۔

میں ایک وقت میں دو حالتوں میں رہتا ہوں
گھٹا بھی چھائی ہے مطلع بھی صاف ہے میرا

پنپ رہے ہیں بیک وقت مجھ میں دو موسم
جو ایک زرد ہے ان میں تو اک ہرا بھی ہے

شاہد ماکلی قابلِ رشک شاعر ہے۔ اس کی شاعری نے حسبِ توقع بے شمار ارتقائی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اس کی شاعری میں روایت کا شعور، نیا کہنے کی للک اور خیال کو خوشبو بنا دینے کی کرامت شروع ہی سے بھرپور طور پر موجود تھی۔ اس کا مطالعہ اُردو ادب کی حدود سے نکل کر عالمی زبانوں تک رسا ہُوا ہے، اور اس سب پر مستزاد، تصوف کی طرف اس کا عملی اور فکری میلان ہے جس نے اسے ایک نئی جہت اور نئی توانائی بخشی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُس کی شاعری اُسے درویشی کی طرف لے گئی یا وہ اپنی شاعری کو درویشی کی طرف لے گیا، لیکن وہ درویش ہے۔ یوں کہ شاعری کی وہ جہت شاہد کی اِس شاعری میں صاف نمایاں ہے جس میں ذات اور کائنات علیحدہ نہیں رہتے۔ شاہد ماکلی ماضی میں رہنے والا مستقبل کا شاعر ہے۔ عہدِ رفتہ اس کے لیے زمانۂ حال ہے۔ وہ قدیم ہواؤں سے زعفران، مُشک، عنبر، عُود اور عبیر کی بو باس کشید کرتا ہے اور اُن لوگوں تک پہنچاتا ہے جو یوڈی کلون کے عہد کی پیداوار ہیں۔ اسے سموک گلاس سے مزیّن جگمگاتی عمارت سے زیادہ چھوٹی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی صدیوں پرانی خستہ حال خانقاہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ شاید وہ اِسی خانقاہ کا ایک درویش ہے۔

کچھ اِس لیے بھی زمانے سے ہم کو نسبت نئیں
کہ جمع و منع و طمع شیوۂ طریقت نئیں
ہے چند اور سلاسل کا فیض بھی مرے پاس
میں صرف سلسلۂ خواب ہی میں بیعت نئیں

میں چل رہا ہوں ترے ساتھ جس محبت سے
تو کیا یہ واقعہ اِس دور میں کرامت نئیں
مشاہدات میں آئی ہیں اور باتیں بھی
مگر بتانے کی مجھ کو ابھی اجازت نئیں
ہماری بزم کا شیوہ ہی اور ہے شاہدؔ
ہم آنے والے کا دِل دیکھتے ہیں، صورت نئیں

شاہد جہاں ایک طرف قدیم ہواؤں سے خوشبوئیں کشید کرتا ہے وہیں دوسری طرف جدید سائنس کی روح کو جذب کر کے اسے اپنے جذبے اور تخیل سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ شاہد کی یہ جہت اُردو غزل کی جہات میں ایک اضافہ ہے کہ اُس نے غزل کے کڑے نظام میں پورے تخلیقی رچاؤ اور سبھاؤ کے ساتھ کوانٹم فزکس، کاسمولوجی اور میٹا فزکس جیسے علوم کے موضوعات کو شاعری بنا دیا ہے۔ سائنس حسن اور تخیل کی دشمن نہیں۔ بلکہ تخیل تو (شاعری کی طرح) سائنس کی بنیاد ہے اور جدید سائنس کے کئی تصورات میں بھرپور شعریت اور حسن موجود ہے۔ مثلاً ٹائم اینڈ سپیس کا تصور، اضافیت کا خصوصی اور عمومی نظریہ، ہائزن برگ کے بے یقینی کے اصول، سٹیفن ہاکنگ کی وقت اور بلیک ہولز سے متعلق تھیوریز، وقت میں سفر کا تصور، مادے اور توانائی کی حالتیں اور ان کا باہمی تبادلہ، روشنی، بے کراں کائنات، کہکشائیں، اجسام کے درمیان کشش وغیرہ۔ شاعری تخلیق ہے تو سائنس تفہیم۔ شاہد نے اپنی غزل میں تخلیق اور تفہیم کو باہم آمیز کر کے سوالات اُٹھائے ہیں۔ اس عمل نے اُس کی غزل میں تحیر کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ شاہد کی غزل ان کو زیادہ لطف دے گی جو اِن ذائقوں کو چکھ چکے ہیں۔

مجھے تو لگتا ہے، چکھ لی ہے روشنی میں نے
کوئی چمکتا ہوا ذائقہ زبان پہ ہے

بڑھا جو سوزِ دروں، آپ میں پگھل گیا مَیں
پھر ایک دن کسی آتش فشاں میں ڈھل گیا مَیں

یہ تو نے کیسے عمل سے مجھے گزارا ہے
کہ ایک وہم تھا اور واقعے میں ڈھل گیا میں
جو اک جہان کی یکسانیت سے تنگ آیا
تو ایک اور جہاں کی طرف نکل گیا مَیں
وہ کیا گرج تھی مَیں سن کر لرز گیا جس کو
چمک تھی کیسی جسے دیکھ کر دہل گیا مَیں
میں اتنی تیزی سے گرمِ سفر ہوں کیوں شاہدؔ
ملے گا کیا جو توانائی میں بدل گیا میں

ازل سے آہ کی صورت سفر میں ہوں شاہدؔ
کسی کو علم نہیں طول موج کیا ہے مرا

یہ ذوق ہے عمل انگیز کی طرح مجھ کو
اُفق اُفق مری رفتار کو بڑھاتا ہوا
ہزار نوری برس پر تھا میری رات سے دن
میں آپ مٹ گیا یہ فاصلہ مٹاتا ہوا
میں اپنے دودھیا رستے سے ہو کے جاتا ہوں
زمیں سے اور کسی کہکشاں کو جاتا ہوا

ہم ایک رت میں اُگاتے تھے پھول دوسری رت کے
کوئی ملاحظہ کرتا عجائبات ہمارے

وہ کیسے اُفُس و آفاق تھے کہ تھے بھی نہیں وہ
اور اُن سے چل بھی رہے تھے تعلقات ہمارے
بدن تھے اور کرن سے بھی تیز تھا سفر اپنا
سو، پیچھے رہ گئے ہم سے دن اور رات ہمارے
وہ بجلی چمکی ہے اِس طرح گھُپ اندھیرے میں شاہدؔ
دمک اٹھے ہیں کئی منظر ایک ساتھ ہمارے

مجھ میں جو ایک قوتِ مرکز گریز تھی
پھیلاؤ اُسی سے دائرۂ کار میں ہوا

میں اِس لیے ہجوم کا حصہ نہیں بنا
سورج کبھی نجوم کا حصہ نہیں بنا

روشنی چاہیے اب مجھ کو حرارت والی
مجھ میں اب رات ہے اور رات زمستانی ہے

یہاں تو سارے ہی منظر ہیں اجنبی شاہدؔ
یہ آ گیا مَیں کہاں وقت میں سفر کرتا

ازل سے پھیلتی اِس کائنات میں شاہد
سکڑتے جاتے ہیں امکان جانے کیوں میرے

میں نے اِن شعروں کے ساتھ چمکتی صبحیں اور سرمئی شامیں بسر کیں۔ بہت مشکل ہے شاہد کا انتخاب کرنا۔ ایک تو اِس لیے کہ اس کی غزلیں پڑھوں تو ان میں بسنے اور سانس لیتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس سے بہتر کوئی سمت ہو تو اس کی طرف پلٹا جائے۔ ان میں رہنا اور سانس لینا، بس یہی اس وقت کا خوب صورت ترین مصرف لگتا ہے۔ اس پر لکھنا تو اس کے ذائقے کو برباد کرنے جیسا لگتا ہے۔ دوسری مشکل یہ کہ غزل در غزل مکمل شامل کرنی پڑتی ہے اور یہ بہر حال زیادتی ہوگی کہ شاہد کو پڑھنے کا شائق کتاب سے پہلے ہی مکمل غزل اِس تحریر میں پڑھ لے۔ لیکن ہر شعر ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ تمام کتاب کا ایک ہی لہجہ ہے جس کے اندر تو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں لیکن اس لہجے اور اسلوب سے باہر نہیں نکلتیں۔۔۔ جیسے ایک منظر کے اندر بے شمار اور بے بہا منظر نمود کرتے رہتے ہیں اور ہر منظر پہلی اور آخری مرتبہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔

شاہد! یہ کتاب خوشی اور اُداسی ایک ہی وقت میں بہم پہنچاتی ہے اور میرے خیال میں اچھی شاعری کی اس سے بہتر دلیل کوئی اور نہیں ہوتی۔ بہت مبارک!

سعود عثمانی

تغزل بھرے سوالات

شاید زیادہ تر لوگ منطق اور استدلال کو ہم معنی قرار دیتے ہوں، مگر حقیقت اِس کے بالکل برعکس ہے۔ درحقیقت یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ استدلال ایک رضا کارانہ اور غیر مستقل عمل کا نام ہے، جب کہ منطق ایک غیر رضا کارانہ اور مستقل امر ہے۔ استدلال میں منطق کا استعمال ناگزیر ہے، جب کہ منطق استدلال سے بالکل آزاد، آفاقی حقائق کا آئینہ ہے۔ ہیوم نے کہا تھا کہ ''اگر استدلال آدمی کے مخالف ہو، تو بالآخر آدمی استدلال کے مخالف ہو جاتا ہے''۔ اِس مخالفت میں آدمی منطق کو اپنی صوابدید میں لیتے ہوئے خود ساختہ حقائق کی طرف مائل ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ ذاتی اطمینان کی صورت میں تو نکل سکتا ہے مگر ایک دیرپا حل کی صورت میں نہیں۔ بدقسمتی سے یہ ذاتی اطمینان بھی ایک زیریں بے اطمینانی کی بنیاد پر کھڑا رہتا ہے، جو انسان کو دوبارہ پوائنٹ زِیرو پر لے آتی ہے۔ منطق اور استدلال کی اِسی ضد سے ایمان کا ظہور ہوتا ہے جو کہ اِس دنیا میں کامل اطمینان کا واحد ذریعہ ہے۔ ایمان آدمی کو منطق اور غیر طے شدہ استدلال کے پنجے سے رِہائی دلوا کر ایک ایسی جنگ کے اختتام تک لے آتا ہے، جہاں ہتھیار پھینکنا ہی اصل فتح ہے۔

ایک عام آدمی کی طرح شاہد مالکی بھی استدلال کا آدمی نہیں۔ ہاں اُس کی بنیادی تربیت منطق کے سائے میں اور روحانی تربیت ایمان کی بانہوں میں انجام پائی ہے۔ لہٰذا ایک عام آدمی کی نسبت اِن مسائل کی پہنائی سے اُس کی کافی یاد اللہ ہے۔ اُس نے منطق کو برتا اور ایمان کو گزارا ہے۔

اُس کی شاعری کا نقطۂ آغاز منطق اور نقطۂ انجام ایمان ہے، اور درحقیقت انسان کی زندگی بھی اِنہی دونوں نقاط کے درمیان گزرتی ہے، کیوں کہ استدلال اور منطق کی مبارزت ٹائم اور اسپیس کی ہم عمر ہے، اور شاید اِس کا انجام بھی ٹائم اور اسپیس کے اختتام کے ساتھ ہی وقوع پذیر ہو۔

نوعِ انسانی اِس مسئلے کے حل سے بہت دور ہے، اور دورِ حاضر میں اِس مسئلے سے صاف آگاہی ہی اِس کا قریب ترین حل ہے کہ آدمی کم سے کم مسئلے کی نوعیت کی حد تک تو کسی ابہام کا شکار نہ رہے۔ صحرا میں ایک پیاسے کا ہمت رکھنا قریب قریب ناممکن ہے، مگر جب اُس کی ملاقات دیگر تشنہ لبوں سے بھی ہو جائے، تو ایک قلبی اطمینان کی صورت ضرور نکلتی ہے۔

مندرجہ بالا بحث کے تناظر میں مضامین کے انبار اور تقاریر کے پہاڑ کھڑے کیے جا سکتے ہیں مگر شاید یہ سب مل کر بھی اتنے مؤثر ثابت نہ ہوں، جتنا کہ ایک خوبصورت شعر۔ شاہد مالکی کی شاعری ایسے بے انتہا خوبصورت اور مؤثر اشعار سے مزیّن ہے۔ جو ابہام ایک عام آدمی کو بے چین کیے رکھتا ہے، شاعری اُسی ابہام کو ایک سادہ اور دل نشیں میڈیم دینے کا نام ہے۔ شاہد کی شاعری میں جوابات تو نہیں، البتہ تغزل سے بھرے سوالات ضرور ہیں۔ یہ سوالات آج کے انسان کا مسئلہ ہیں، جن کا اظہار شاہد مالکی نے کمال خوب صورتی، چابک دستی اور ہنرمندی سے کر کے، قاری کو کم سے کم اپنے سوال سمجھنے کے قابل ضرور بنا دیا ہے۔

نہ جانے آپ کہاں ہوں میں اِس گھڑی شاہدؔ
بدن زمین پہ ہے، روح آسمان پہ ہے

حسنین سحر



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
پڑھتے ہی کھُلتا گیا بابِ نعیم

تازہ مُسافت پہ نکلتے ہوئے
وردِ زباں تھی کوئی حمدِ قدیم

دل کبھی ناشاد، کبھی شاد تھا
زادِ سفر تھا مرا اُمید و بیم

ایک مُسافر تھا مَیں اُس شہر میں
اور سمجھتا رہا خود کو مقیم

ایک ترا خواب ہو محرم مرا
ایک تری یاد ہو میری ندیم

چاہے سبھی حرف مجھے بھول جائیں
یاد رہے ایک الف ، ایک میم

میری مناجات مکمل ہوئی
نظریں ہیں اب تیری طرف اے کریم



دست بستہ ہوں، شکستہ ہوں، بہت خستہ ہوں
لاج رکھ لیں کہ حضور آپؐ سے وابستہ ہوں



اور اب نگاہ اُسی آخری نشان پہ ہے
وہ جس کے ہونے کا دار و مدار دھیان پہ ہے

یہ کیسی سرحدِ ایام پر مقیم ہوں میں
کہ لازماں کا بھی سایہ مرے مکان پہ ہے

میں چاہے عرش کو جالوں، رہوں گا وہم کا وہم
مرے وجود کی بنیاد ہی گمان پہ ہے

بنے گا کیا، جو توازن بگڑ گیا اس کا
کہ سارا بارِ امانت ہی خاکدان پہ ہے

اب اور ہی کوئی دیکھے گا جاودانی تری
مری تو عمر کا پھیلاؤ ایک آن پہ ہے

میں اپنے ابر کو پہچانتا ہوں اچھی طرح
یہ رم جھم اور جہاں کی مرے جہان پہ ہے

مجھے تو لگتا ہے، چکھ لی ہے روشنی میں نے
کوئی چمکتا ہُوا ذائقہ زبان پہ ہے

نہ جانے آپ کہاں ہوں مَیں اِس گھڑی شاہدؔ
بدن زمین پہ ہے، روح آسمان پہ ہے

مرے ہی سانس کے بل پر فروغ پاتا ہوا
یہ کیسا شعلہ ہے مجھ میں جگہ بناتا ہوا

یہ ذوق ہے عمل انگیز کی طرح مجھ کو
اُفق اُفق مری رفتار کو بڑھاتا ہوا

ہزار نوری برس پر تھا میری رات سے دن
میں آپ مٹ گیا یہ فاصلہ مٹاتا ہوا

میں اپنے دو دھیار ستے سے ہو کے جاتا ہوں
زمیں سے اور کسی کہکشاں کو جاتا ہوا

کہیں نہ اپنی بصارت سے ہاتھ دھو بیٹھوں
اک آفتاب کو میں آئنے میں لاتا ہوا

خواص، جانیے، کیا تھے دل اور دنیا کے
میں خود جھلس گیا باہم انھیں ملاتا ہوا

کبھی اُترتا ہوا اپنی آخری تہ تک
کبھی مَیں اپنے کناروں سے لوٹ آتا ہوا

کہیں مَیں ہوں بھی نہیں اور زمین والوں کو
دِکھائی دے بھی رہا ہوں مَیں جھلملاتا ہوا

پتہ نہیں کہ یہ جھونکا کدھر سے آیا ہے
مری اُداسی کو سرشار کر کے جاتا ہوا

دراصل سب کو مسرت میں کر رہا ہوں شریک
کہیں کا عکس کہیں اور مَیں دِکھاتا ہوا

اور اب تو خود بھی مَیں ٹکڑوں میں بٹ گیا شاہدؔ
یہ مونتاج کسی کے لیے بناتا ہوا

جُدا تھے کیمیا دانوں سے کلّیات ہمارے
دل و دماغ دھڑکتے تھے ایک ساتھ ہمارے

ہم ایک رت میں اُگاتے تھے پھول دوسری رت کے
کوئی ملاحظہ کرتا عجائبات ہمارے

کبھی خبر میں نہ آئی ہماری خواب نگاری
کسی نظر سے نہ گزرے مسوّدات ہمارے

اِدھر بھی ایک خلا تھا، اُدھر بھی ایک خلا تھا
یہ کس ستارے کے اُوپر تھے خیمہ جات ہمارے

وہ کیسے اَنفُس و آفاق تھے کہ تھے بھی نہیں وہ
اور اُن سے چل بھی رہے تھے تعلقات ہمارے

بدن تھے اور کرن سے بھی تیز تھا سفر اپنا
سو، پیچھے رہ گئے ہم سے دن اور رات ہمارے

رہا نئے سے نئے مرحلے کا سامنا ہم کو
سو، کام آتے بھی کیا پہلے تجربات ہمارے

نتیجہ اور بر آمد ہوا تو تب سمجھ آئی
غلط تھے سارے قیاس و مشاہدات ہمارے

بعید ہم سے نہیں ہے کہ خود ہی اُس کو مٹا دیں
کبھی جو آ گیا اپنا سراغ ہاتھ ہمارے

خوشا یہ دھیان کا دھارا جو اپنے ساتھ ہی اب کے
بہا کے لے گیا لمحاتِ بے نشاط ہمارے

وہ بجلی چمکی ہے اِس طرح گھُپ اندھیرے میں شاہدؔ
دَمک اُٹھے ہیں کئی منظر ایک ساتھ ہمارے

بڑھا جو سوزِ دروں، آپ میں پگھل گیا مَیں
پھر ایک دن کسی آتش فشاں میں ڈھل گیا مَیں

میں اوّل اوّل اُن آنکھوں کی بے نیازی سے
گرفتہ دل تو ہوا، بعد میں سنبھل گیا مَیں

یہ میں تھا، جو تری یادوں سے کتنا خالی تھا
اور اب جو دیکھیے تو کیسا پھول پھل گیا مَیں

یہ تو نے کیسے عمل سے مجھے گزارا ہے
کہ ایک وہم تھا اور واقعے میں ڈھل گیا مَیں

جو اک جہان کی یکسانیت سے تنگ آیا
تو ایک اور جہاں کی طرف نکل گیا مَیں

وہ کیا گرج تھی مَیں سن کر لرز گیا جس کو
چمک تھی کیسی جسے دیکھ کر دہل گیا مَیں

میسر آئی تھی خلوت زمانوں بعد اُس دن
جو خود سے ملنے گیا بھی تو بے محل گیا مَیں

جو کب سے سوچی ہوئی تھی نہ جانے کس کے لیے
وہ ایک چال بھی آج اپنے ساتھ چل گیا مَیں

اور اب کھُلا، وہ قیامت کا خواب تھا جس میں
ابد سے ہوتا ہُوا جانبِ ازل گیا مَیں

یہ مہر و مہ سے تعلق کی کون منزل ہے
کہ دھوپ سہہ گیا اور چاندنی سے جل گیا مَیں

میں اتنی تیزی سے گرمِ سفر ہوں کیوں شاہدؔ
ملے گا کیا جو توانائی میں بدل گیا مَیں

یہ قبل و بعد سے جو انحراف ہے میرا
زمانے کے لیے کب انکشاف ہے میرا

چلو کہ سیر کرا لاؤں مَیں وہاں کی تمھیں
جو روز و شب سے اُدھر کوہ قاف ہے میرا

میں ایک وقت میں دو حالتوں میں رہتا ہوں
گھٹا بھی چھائی ہے، مطلع بھی صاف ہے میرا

سلوک، دیکھیے، کیا ہو مری زمین کے ساتھ
بیان اب کے فلک کے خلاف ہے میرا

یہ دل حرم ہے مجھے، مرکزہ نہیں، لوگو!
سمجھتے ہو جسے گردش، طواف ہے میرا

اور اب یہ کام بدن سے مَیں لینے والا ہوں
کہ روح میں کوئی دن اعتکاف ہے میرا

کیا ہے پیش فقط نقطۂ نظر میں نے
وگرنہ آپ سے کیا اختلاف ہے میرا

اِسے ہٹا کے ہی مجھ تک رسائی ہو گی تری
تُو لفظ کہتا ہے جس کو، غلاف ہے میرا

تو کیا ہوا، جو دکھایا ہے میرا دِل تو نے
تجھے تو خون بھی شاہدؔ معاف ہے میرا

خواب کا سلسلہ ہے اور کہیں
چل یہاں سے، فضا ہے اور کہیں

شہر ناسازگار ہے مجھ کو
میری آب و ہوا ہے اور کہیں

میں کہیں اور جانا چاہتا ہوں
راستہ جا رہا ہے اور کہیں

یہاں بِن دیکھے مانیے اُس کو
آمنا سامنا ہے اور کہیں

واقعہ اور ہی کہیں کا ہے
رو نما ہو رہا ہے اور کہیں

جو اِسی زندگی میں چاہیے ہے
وہ مسرّت بھی کیا ہے اور کہیں

عکس، جو آئنے میں تھا شاہدؔ
منتقل ہو گیا ہے اور کہیں

ایسی الم ناک تھی ہجر بیانی مری
ارض وسمارو پڑے سن کے کہانی مری

اب مجھے پہچاننا اور بھی آسان ہے
اِن دنوں اک زخم ہے خاص نشانی مری

میں جو نہ ماضی میں ہوں، حال نہ فردا میں ہوں
لے گئی مجھ کو کہاں نقل زمانی مری

ہجر بدن کا نہیں، روح کا ہم عمر ہے
تجھ سے شناسائی ہے کتنی پرانی مری

وقت سے باہر تھا مَیں، مجھ کو پتہ ہی نہ تھا
راگ ہے بے وقت کا، زمزمہ خوانی مری

چپ میں غنیمت ہوں مَیں، شور میں خمیازہ ہوں
سنیے تو آواز ہوں، ورنہ اک آوازہ ہوں

دھوپ مری زندگی، سایہ مری موت ہے
رات کو پژمُردہ ہوں، دن میں تروتازہ ہوں

میں کہ ہوں اک عہد سے اور کسی عہد تک
عرصۂ امکان کا طے شدہ اندازہ ہوں

عکس ہے اوراق میں بکھری ہوئی ذات کا
اصل میں ہوں مُنتشر، کہنے کو شیرازہ ہوں

یعنی ہُوا ہی نہیں مجھ سے کسی کا گزر
وقت کی دیوار میں نام کا دروازہ ہوں



نیند میں کھُلنے والے در کی خبر
خواب کا خواب ہے، خبر کی خبر

اِس طرف آتے قافلوں سے مِلی
اُس طرف جاتی رہ گزر کی خبر

ساتویں سمت کا سفر نامہ
دے گیا جانبِ دِگر کی خبر

اب زمین و زماں سے باہر ہوں
شام کی ہے نہ کچھ سحر کی خبر

دل میں یک سُو ہیں چار سُو شاہدؔ
اِس کو ہے سب اِدھر اُدھر کی خبر



یہ میں جو چھوڑی ہوئی رہ گزر تک آیا ہوں
ہزار رستوں سے ہو کر اِدھر تک آیا ہوں

وگرنہ میں تو بہت خوش تھا وقت سے باہر
بلایا تو نے تو شام و سحر تک آیا ہوں

مجھے تو کام نہ صحرا سے تھا نہ دریا سے
نہ جانے کس لیے میں خشک و تر تک آیا ہوں

ملا نہیں ہے یہاں بھی مجھے جواز اپنا
میں رایگاں ہی جہانِ دگر تک آیا ہوں

اور اب کھُلا، یہ تجلّی تو میری خاک میں تھی
میں جس کو ڈھونڈتا سورج کے گھر تک آیا ہوں

پڑا ہے ویسے کا ویسا ابھی سفر میرا
ابھی مَیں خواب میں اپنی خبر تک آیا ہوں

وہ رُت، وہ آب و ہوا رہ گئی نہ جانے کہاں
میں جس کی معرفت اپنے ثمر تک آیا ہوں

پتہ نہیں، وہ سہولت ہے کیا کہ جس کے لیے
میں اِتنی مشکلوں سے تیرے در تک آیا ہوں

اُسی یقین سے لوٹوں، خدا کرے، شاہدؔ
میں جس یقین سے بابِ اثر تک آیا ہوں

اور اب تو اذنِ سفر بھی ہے، راستہ بھی ہے
میں چل پڑا ہوں تو چلنے کا حوصلہ بھی ہے

سنا تو میں نے یہی ہے، جدھر روانہ ہوں
اُدھر ہے تازہ ہَوا بھی، نئی فضا بھی ہے

ہری کچور فضاؤں سے یہ گزرنا مرا
کہیں کہیں مرے قدموں کو روکتا بھی ہے

نشاں لگاتا چلوں راستے کے پیڑوں پر
کہ مجھ کو اِس گھنے جنگل سے لوٹنا بھی ہے

پنپ رہے ہیں بیک وقت مجھ میں دو موسم
جو ایک زرد ہے اِن میں تو اک ہرا بھی ہے

دھری ہیں دھیان کے ایزل پہ چند تصویریں
کہ جن میں تُو بھی ہے، میں بھی ہوں اور خدا بھی ہے

سنی ہے غم زدہ جھونکوں کی سِمفنی میں نے
عجیب اِس میں تو پہلو نشاط کا بھی ہے

سفر طویل تو ہے ہی تلاش کا شاہدؔ
کہیں کہیں تو بہت صبر آزما بھی ہے

❁

جدھر بھی دیکھیے تکرار کا تماشا ہے
نظارہ کیا کریں، بے کار کا تماشا ہے

چلے ہی جائیں گے کچھ دیر میں تماشائی
بکھر ہی جائے گا، بازار کا تماشا ہے

میں وقت کس لیے ضائع کروں یہاں رک کر
یہ شورِ راہ تو ہر بار کا تماشا ہے

وہ مہر و مہ ہوں کہ ہم تم، سب اک مدار میں ہیں
سفر کے نام پہ رفتار کا تماشا ہے

تعلق اِس کا زمیں سے بھی کوئی ہے کہ نہیں
یہ رو بہ رو جو فلک پار کا تماشا ہے

سمجھ میں جتنا بھی آئے اُسے غنیمت جان
یہ ایک عالم اَسرار کا تماشا ہے

نظارگی مرے احوال کی ہے اور کہیں
یہاں تو بس مرے آثار کا تماشا ہے

رواں دواں ہیں مجھی میں رُکے ہوئے مہ و سال
مجھی میں ثابت و سیّار کا تماشا ہے

کوئی بھڑکتی ہوئی آگ مجھ میں ہے شاہدؔ
اور آگ میں گل و گلزار کا تماشا ہے

بظاہر اپنی ہی دنیا سے رابطہ ہے مرا
پر ایک اور جہاں سے بھی سلسلہ ہے مرا

کسی سفینے کا محتاج اب کہاں ہوں مَیں
اب اپنی موج ہے اور اپنا تیرنا ہے مرا

کھلی یہ بات بھی چوتھے زمانے میں آ کر
کہ حال و ماضی و مستقبل ایک سا ہے مرا

ہوئی ہے خواب میں جب سے خبر کی آمیزش
خیال اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے مرا

مری خموشی نہ سمجھو مری خموشی کو
سمے کے پردے میں یہ خود کلامیہ ہے مرا

نہ میں حضوری میں خوش ہوں نہ تیری دوری میں
خمیر، جانیے، کس خاک سے اُٹھا ہے مرا

چلی گئی ہیں مجھے چھوڑ کر سب آوازیں
بس اک سکوت ہے جو ساتھ دے رہا ہے مرا

مَیں جو بھی کچھ ہوں محبت کے پیش لفظ میں ہوں
یہ ابتدائیہ ہی اختتامیہ ہے مرا

کہیں ہے ذات کہیں کائنات پیشِ نظر
کبھی خدا کبھی خود سے مکالمہ ہے مرا

یہ ہست و نیست کے مالک سے پوچھیے جا کر
وجود کیوں عدم آثار ہو رہا ہے مرا

میں کُل جہاں کے عوَض بھی یہ غم نہیں دوں گا
یہ غم جو لامُتَناہی نشاطیہ ہے مرا

ازل سے آہ کی صورت سفر میں ہوں شاہدؔ
کسی کو علم نہیں، طول موج کیا ہے مرا

آ گئی دل کو جگمگانے مرے
روشنی سے ہیں دوستانے مرے

سب گراں گوش تھے، جہاں مَیں تھا
نا شُنیدہ رہے فسانے مرے

اب تو کب سے پڑے پڑے مجھ میں
دکھ ہُوئے جاتے ہیں پرانے مرے

حال ہے ماضی ہے نہ مستقبل
وقت کا پھیر ہیں زمانے مرے

اب ہوں سچ مُچ کا پیرہن شاہدؔ
بسکہ اُلجھے ہیں تانے بانے مرے



پہلے گریزاں تھا کیوں اِس طرف آنے سے مَیں
آیا ہوں جس راہ پر تیرے بلانے سے مَیں

میں نے کیا ہے سفر وقت میں اے اجنبی!
پہنچا ہوں اِس دور تک اور زمانے سے مَیں

کٹ گیا اطراف کے بڑھتے ہوئے شور سے
دور کی آواز کو دھیان میں لانے سے مَیں

بچھڑی ہوئی روح کی ایک جھلک دیکھنے
جاتا رہا جسم پار یونہی بہانے سے مَیں

کوئی نہیں جانتا، جاتا تھا لے کر کہاں
لاتا تھا روز ایک عکس آئنہ خانے سے مَیں

آج سرِ روز و شب، مل ہی گئی وہ گھڑی
جس کا تمنائی تھا ایک زمانے سے مَیں



اک حدِ لازماں تھی اور اُس پہ تھا گھر مرا
ہوتا تھا سارا وقت اُسی میں بسر مرا

جب تک تمھاری یاد مری ہم رکاب تھی
کس درجہ خوش گوار تھا سیر و سفر مرا

خود ناشناس ہوں تو سبب ایک یہ بھی ہے
وقت اپنے ساتھ گزرا بہت مختصر مرا

ایسا نہیں کہ ایسا فقط میرے ساتھ ہے
دل بھی کھِل اُٹھتا ہے تری آواز پر مرا

کھلتے نہ زندگی کے حروفِ مقطّعات
ہوتا نہ تیرا عشق معلم اگر مرا

دل میں اُتارلوں یہ نظر سے گزرتے عکس
شاید نہ ہو یہاں سے دوبارہ گزر مرا

ممکن ہے، اگلا مرحلہ اِس سے بھی سخت ہو
اب دیجیے گا ساتھ بہت سوچ کر مرا

ترکیب ہی بدل گئی پورے وجود کی
اک ذرہ کیا ہُوا ہے اِدھر سے اُدھر مرا

اِس وقت شش جہات سے باہر ہوں مَیں کہیں
یہ پوچھنا فضول ہے، رخ ہے کدھر مرا

بہم ہوئے ہیں اب آ کر ابدازل دل میں
ملا ہے مجھ کو مرے مسئلے کا حل دل میں

پڑے رہو ابھی کچھ دن دماغ کے اندر
کہ بے امانی کا عالم ہے آج کل دل میں

میں اتنا عادی ہوا شورِ بے نہایت کا
بہت خموشی سے پڑتا ہے اب خلل دل میں

اب اُس سے میری محبت نہیں دِکھاوے کی
اب اُس کی بات پہ کرتا ہوں مَیں عمل دل میں

بالآخر اتنے برس کی زماں نوَردی کے بعد
میسّر آ ہی گیا عافیت کا پل دل میں

مہک اُٹھا مرا سینہ بھی، میری سانسیں بھی
کھلے ہیں جانیے کس رت کے پھول پھل دل میں



نہیں تھا کچھ بھی اگر شش جہات سے باہر
خیال کیوں گیا پھر ممکنات سے باہر

بکھر گیا ہوں اب اتنا کہ مجھ پہ کھُلتا نہیں
میں کتنا ذات میں ہوں، کتنا ذات سے باہر

اُٹھا کے اپنے شبستان میں ہی لے آؤں
پڑی ہوئی ہے جو اک صبح رات سے باہر

بروئے کار مَیں لاؤں گا پھر کہاں خود کو
کبھی جو ہو گیا دل کی بساط سے باہر

لبالب اتنا مجھے رکھتا ہے کوئی شاہدؔ
چھلکتا رہتا ہوں اب کائنات سے باہر



کبھی جو رات کی منجدھار سے گزرنے لگا مَیں
تو اپنے ڈوبے ہوئے دن کو یاد کرنے لگا مَیں

نہ جانے حال ہو کیا اُس خنک فضا میں پہنچ کر
کہ جس کے صرف تصور سے ہی ٹھٹھرنے لگا مَیں

مری تو روز کی عادت تھی اک طرف سے نکلنا
یہ آج دوسری جانب سے کیوں اُبھرنے لگا مَیں

سنائی دینے لگی تو سمجھ بھی آنے لگی ہے
یہ اب جو دور کی آواز پر ٹھہرنے لگا مَیں

دوبارہ بیٹھ گیا ہوں یہ سوچتا ہوا دل میں
یہ بے خیالی کے زینے سے کیوں اُترنے لگا مَیں

یہ روشنی سے ملاقات کا ہو تجربہ شاید
سفر اندھیرے کی رفتار سے جو کرنے لگا مَیں

نہ جانے کون سی مٹی سے پھوٹتا ہوں دوبارہ
چہار سو زرِ گل کی طرح بکھرنے لگا مَیں

پھرا ہوں گوش بر آواز شش جہات میں برسوں
بالآخر اپنی خموشی پہ کان دھرنے لگا مَیں

میں سانس لینے لگا ہوں یہ کن فضاؤں میں شاہدؔ
ہوا یہ کیسی ہے جو پھیپھڑوں میں بھرنے لگا مَیں



دکھائیں کیا کہ دِکھائی نہ دینے والے ہیں
بتائیں کیا، ہمیں کن منظروں نے گھیر لیا



پورا کھلتا نہ بند ہوتا ہوں
میں بھی کیا نیم وا دریچہ ہوں!

دو اندھیروں کے درمیاں ہوں کہیں
صبحِ کاذب کا کوئی لمحہ ہوں

میں ہی لایا یہاں تلک تم کو
میں ہی اب واپسی کا رستہ ہوں

عینی شاہد ہوں اپنی حالت کا
اِسم ہوں اور بامسمّیٰ ہوں

عنقریب اپنے خوابِ خلوت کو
جلوت آثار کرنے والا ہوں

آدمی ہوں، مَیں آئنہ تو نہیں
ٹوٹ جاؤں تو جڑ بھی سکتا ہوں

خاموشی میں ہُوا ہے نہ گفتار میں ہوا
دل کا جو حال حسرتِ اظہار میں ہوا

روز اک نیا نظارہ سمایا نگاہ میں
روز اک اضافہ خوابوں کے انبار میں ہوا

بادِ بہار نے تو رکھا بے نمو مجھے
سرسبز تو مَیں اپنے ہی آثار میں ہوا

مجھ میں جو ایک قوتِ مرکز گریز تھی
پھیلاؤ اُسی سے دائرۂ کار میں ہوا

ناوقت کو بھی جالیا ہم نے پھر ایک دن
ایسا اِضافہ وقت کی رفتار میں ہُوا

کھُلتا ہی نہیں یہ کیا سفر ہے
منزل ہے نہ جس میں رہ گزر ہے

آوازہ ہے جانے کس گلی کا
مُدّت سے جو مجھ میں دربہ در ہے

سمتوں کا سرا ملے تو جانوں
اِس پل مَیں کدھر ہوں، تُو کدھر ہے

تصویر سے باہر آؤں کیسے
جس میں نہ دریچہ ہے نہ در ہے

لوٹ آیا ہوں گھوم پھر کے ہر جا
اب خاک ہی میرا مُستقر ہے



نفَس نفَس نئے سانچے میں ڈھلتا رہتا ہوں
مَیں اپنی حالت و ہیت بدلتا رہتا ہوں

مسافت ایسی ہے، اُس کی طوالت ایسی ہے
کہ اب مَیں خواب کے اندر بھی چلتا رہتا ہوں

محیطِ آب میں ہوں برف زار کے مانند
اور اپنے سوزِ دروں سے پگھلتا رہتا ہوں

شعاعیں پہنچیں نہ پہنچیں زمین تک میری
میں اپنے آپ میں دن رات جلتا رہتا ہوں

اور اب مَیں رہتا ہوں اک حالتِ توازن میں
کہ گرتا رہتا ہوں اور پھر سنبھلتا رہتا ہوں

کبھی میں دوسرے رخ سے بھی اُبھروں گا شاہدؔ
ابھی تو ایک طرف سے نکلتا رہتا ہوں



رکھا ہے سلسلہ تو ایک ذات سے مَیں نے
چُنی ہیں خوشبوئیں کُل کائنات سے مَیں نے

تھی ایک سَمت نہ ایسی جو تجھ سے مِلواتی
نکالا راستہ پھر شش جہات سے مَیں نے

خدا کرے کہ مہکتا ہوا بھی دیکھوں اُنھیں
اُگائے ہیں جو گلاب اپنے ہاتھ سے مَیں نے

یہ میرے ہاں جو فضا ہے شرر فشانی کی
اِسے کشید کیا اپنی رات سے مَیں نے

اَساسِ آگہی مفروضے پر رکھی شاہدؔ
نتائج اخذ کیے تجربات سے مَیں نے



جانے اِس کھیل میں کیا باقی ہے، کیا فانی ہے
اک ندا آ چکی اور ایک ابھی آنی ہے

فرق اب ختم ہوا منظر و پس منظر کا
پوری تصویر میں اب ایک سی ویرانی ہے

شعلوں میں لپٹا سرِ عام نکل آیا ہوں
اب پریشانی مری سب کی پریشانی ہے

گم ہوئے جاتے ہیں آ آ کے اُجالے جس میں
مجھ میں کیسی یہ اندھیرے کی فراوانی ہے

روشنی چاہیے اب مجھ کو حرارت والی
مجھ میں اب رات ہے اور رات زمستانی ہے



مَیں کیوں نہ اور کسی سَمت میں سفر کرتا
چہار سُو پہ مَیں کب تک گزر بسر کرتا

مطابقت ہی نہیں تھی نگاہ و منظر میں
نظارہ کیسے بھلا روح پر اثر کرتا

جو مجھ کو پانچویں رت میں میسر آئی تھی
مَیں اُس شگفتہ دِلی کی کسے خبر کرتا

کئی فضائیں تھیں ان کی رسائی سے باہر
مَیں انحصار کہاں تک حواس پر کرتا

یہاں تو سارے ہی منظر ہیں اجنبی شاہدؔ
یہ آ گیا مَیں کہاں وقت میں سفر کرتا



ہاں، لوٹ تو آئے گا وہ شب تک
دن کیسے گزاروں گا میں تب تک

رکھوں گا مَیں پردہ بے دِلی کا
لاؤں گا نہ دل کی بات لب تک

پھر نام و نشاں کہاں ہمارا
ہم ہیں ترے موسمِ طلب تک

میں واقعے تک تو آچکا ہوں
اب مجھ کو پہنچنا ہے سبب تک

اے ربِّ مشارق و مغارب!
لاسمتی مرا نصیب کب تک

یہ موج رواں رہے گی مجھ میں
دریا سے مکالمہ ہے جب تک



منزل سے گریز پا کہاں ہے
یہ راستہ راستہ کہاں ہے

اے نورِ سحور! کس سے پوچھوں
وہ شمع، وہ طاقچہ کہاں ہے

تم جس کی نوید دے رہے تھے
خوشبو کا وہ قافلہ کہاں ہے

جس کے لیے ہم یہاں تک آئے
وہ قریۂ دل کُشا کہاں ہے

دیکھیں تو ہزار صورتیں ہیں
لیکن کوئی دیکھتا کہاں ہے

تجسیم کے رمزیوں سے پوچھو
خوشبو کا مجسمہ کہاں ہے

منظر کی مصوری میں گم ہوں
احساس ہی وقت کا کہاں ہے



میں اپنی لاٹھی سے پتّے تو جھاڑ سکتا ہوں
میں اِس سے پانی میں رستہ بنا نہیں سکتا



تمنا سے جو خالی ہو گیا دل
تو پھر میرے لیے کس کام کا دل

تو کیا مقصود دل سوزی کا یہ ہے
کہ خاکستر سے پیدا ہو نیا دل

ہوا کو کیا ضرورت جاننے کی
یہ برگِ سبز ہے یا پیڑ کا دل

ابھی یہ بحث قبل از وقت ہو گی
کہ وحشت میں کہاں تک جائے گا دل

میں دل کی بات لکھنا چاہتا ہوں
اگر مجھ کو اجازت دے مرا دل



دور کے برگ و بر لیے پھرا مَیں
دل میں باغِ دگر لیے پھرا مَیں

وہ مہک رہ گزر کی تھی ہی نہیں
جو سرِ رہ گزر لیے پھرا مَیں

اپنے ہمراہ اپنی حالت کو
جانے کیا سوچ کر لیے پھرا مَیں

اک بدن تھا اور اُس کا سایہ تھا
جو اِدھر سے اُدھر لیے پھرا مَیں

کہیں ہے بھی وہ زندگی کہ نہیں
جس کے شام و سحر لیے پھرا مَیں

بے طلسمانہ ، بے حجابانہ
اک شبیہ اشک بھر لیے پھرا مَیں

کچھ نہایت قدیم سلسلے تھے
دل پہ جن کا اثر لیے پھرا مَیں

اُس کے ساتھ ایک پل گزارا تھا
ایک پل عمر بھر لیے پھرا مَیں

جانے کیا رنج تھا مجھے شاہدؔ
رات دن آنکھ تر لیے پھرا مَیں

دِکھائی دیتے نہیں ہیں زمانے کیوں میرے
زمانے کر دیے اوجھل قضا نے کیوں میرے

مری بُنَت تو ہمیشہ سے تیرے ہاتھ میں ہے
اُلجھتے جاتے ہیں پھر تانے بانے کیوں میرے

جو شے نظر نہیں آتی، دِکھائیں اُس کا بھی عکس
رہین جسم ہیں آئینہ خانے کیوں میرے

ابھی تو ذہن سے جھٹکا تھا اِس ہیولے کو
پھر آ کے بیٹھ گیا ہے سرہانے کیوں میرے

کس انہماک سے بیٹھا میں خود کو پڑھتا تھا
اُلٹ پلٹ دیے پنّے ہَوا نے کیوں میرے

ازل سے پھیلتی اِس کائنات میں شاہدؔ
سکڑتے جاتے ہیں اِمکان جانے کیوں میرے

لہروں پہ تموج کا گماں ہے بھی نہیں بھی
تصویر کا دریا ہے، رواں ہے بھی نہیں بھی

جھونکے کبھی چلتے ہیں، کبھی چلتے نہیں ہیں
خوشبو مری پیغام رساں ہے بھی نہیں بھی

کچھ دِن سے مرے آئنے میں عکس ہے جس کا
اُس آتشیں منظر کا دھواں ہے بھی نہیں بھی

اب اپنے سوا حال کسی سے نہیں کہتا
ہم راز مرا کوئی یہاں ہے بھی نہیں بھی

اب گل سے نہیں دِل سے بناتا ہوں مَیں کوزے
اب میرا ہنر کارِ زیاں ہے بھی نہیں بھی

تنہائی ہے اور ماہِ شبِ چار دَہُم ہے
رستوں کی فضا نور فشاں ہے بھی نہیں بھی

چاہوں تو مَیں بولوں، جو نہ چاہوں تو نہ بولوں
گویا کہ مرے منہ میں زباں ہے بھی نہیں بھی

میں خواب میں جی بھر کے جہاں سیر کروں ہوں
اُس باغِ تماشا کا نشاں ہے بھی نہیں بھی

اب دیکھیے دیوار پہ بنتا ہے کہ دل پر
یہ نقش کہ نقشِ گزراں ہے بھی نہیں بھی

نم گرفتہ تو ہو گی، شام جو ہے
شام پھر تیرے غم کے نام جو ہے

سب کو چُپ لگ گئی ہے، کیوں نہ لگے
آج ہم سے وہ ہم کلام جو ہے

آج ہی اِس طرف سے گزرا نہیں
ہم کو جھونکے سے آج کام جو ہے

رہتی ہیں روح سے ملاقاتیں
رات دن جسم میں قیام جو ہے

بس کہ امکاں بھرا ہے نقش مرا
روزِ اوّل سے ناتمام جو ہے

ہاؤ ہو کیوں نہ اب عروج پہ ہو
اب تماشے کا اختتام جو ہے



دل منسلک ہے تیرے درِ خواب سے مرا
کب سلسلہ ہے اور کسی باب سے مرا

مجھ میں سکوت کی وہ فضا اب نہیں رہی
رہتا ہے اب مکالمہ احباب سے مرا

اب آسماں کو اور طرح دیکھتا ہوں میں
اب اور ہے معاملہ مہتاب سے مرا

پابستہ ہے بدن تو بدن کا قصور ہے
دل کب بندھا ہے عالمِ اسباب سے مرا

قریہ بہ قریہ کس لیے تجھ کو کروں تلاش
چلتا ہے کام جبکہ ترے خواب سے مرا

خود تو کنارِ جُو کسی جھلمل میں محو ہوں
پیدا ہے عکس آئنۂ آب سے مرا

نادیدہ رنگ و بو سے نہیں رغبت آج کی
رشتہ قدیم ہے گلِ نایاب سے مرا

تصویر ہوں کسی سحر آثار باغ کی
روشن ہے منظر اپنی تب و تاب سے مرا



[خالد احمد کے لیے]

احوال کا گنجینہ، تب آپ تھے اب ہم ہیں
آہوں سے بھرا سینہ تب آپ تھے اب ہم ہیں

مہجور پرندوں کا ، بے بُور درختوں کا
اک ہمدمِ دیرینہ، تب آپ تھے اب ہم ہیں

ہر درد بھرے دِل میں اب عکس ہمارا ہے
آئینہ در آئینہ، تب آپ تھے اب ہم ہیں

بھُولے سے بھی اب کوئی دہراتا نہیں ہم کو
اک قصۂ پارینہ، تب آپ تھے اب ہم ہیں

یہ خوابِ شناسائی ویسا ہے ہمارا شاہدؔ
اِس خواب کا سبز ینہ تب آپ تھے اب ہم ہیں



خود میں ہے کہیں سفر ہمارا
آساں نہیں رہ گزر ہمارا

کٹ جائے گی رات تو کسی طور
ہوگا نہیں دن بسر ہمارا

بِن دیکھے ہی مانتے ہیں تجھ کو
ایمان ہے غیب پر ہمارا

ہاتھ آئے تو کوئی دھن بنائیں
اک سُر ہے اِدھر اُدھر ہمارا

اک خواب ہے، اک کتاب شاہدؔ
سامان ہے مختصر ہمارا



کہیں قیام اگر ہو مسافرانہ مرا
تو مجھ سے پہلے پہنچتا ہے آب و دانہ مرا

کوئی سوال کرے تو خموش رہتا ہوں
کسے خبر کہ تجاہل ہے عارِفانہ مرا

کسی کو کیسے مری روشنی دکھائی دے
کہ اپنی ذات کے اندر ہے جھلملانا مرا

کبھی تو اُس سے ملاقات بالمُشافہ بھی ہو
جس آئنے سے تعارف ہے غائبانہ مرا

اچانک آج کسی شعلہ رو کی یاد آئی
چمک اُٹھا ہے اچانک سیاہ خانہ مرا

میں ایک روح کی خلوت سرا میں رہتا ہوں
بدن کے علم میں ہے ہی نہیں ٹھکانہ مرا

ابھی نہیں ہے مری بے تکلّفی خود سے
نیا نیا ہے ابھی خود سے دوستانہ مرا

ہزار شکر کہ ہم عصر اپنا ہوں شاہدؔ
ہزار شکر کہ مجھ کو ملا زمانہ مرا



جب تک وہ میرے سامنے لاتا نہیں مجھے
آئے گا اپنے ہونے کا کیسے یقیں مجھے

میں آبِ جُو سا جس کی طرف ہوں رواں دواں
سوکھا ہُوا ملے نہ وہ دریا کہیں مجھے

اطراف میں اُترتی ہوئی شام دیکھ کر
یاد آ رہا ہے کوئی ستارہ جبیں مجھے

یہ جو مکاں سا دیکھ رہے ہو کھنڈر کے پاس
وہ سایہ پہلی بار ملا تھا یہیں مجھے

یہ تو اِدھر کسی نے توجہ دلائی ہے
ورنہ یہ ساری باتیں کہاں یاد تھیں مجھے

اپنے سِوا کہیں کوئی جائے اَماں نہ تھی
ہونا پڑا ہے خود میں ہی گوشہ نشیں مجھے

یہ لمحہ صرف لمحہ نہیں میری عمر ہے
اِس لمحے تک پہنچنے میں صدیاں لگیں مجھے



سوال یہ ہے اُسے کیسے پُر کروں شاہدؔ
وہ اک خلا جو مرے ہونے سے ہُوا پیدا



میں جدھر ہوں اُدھر نہیں کوئی
خواب ہے یہ خبر نہیں کوئی

اب میں حیراں نہیں، پریشاں ہوں
عکس پیشِ نظر نہیں کوئی

موت کے بعد پھر سے آلے گی
زندگی سے مفر نہیں کوئی

اب مَیں ہر بات دل سے سوچتا ہوں
بوجھ اب ذہن پر نہیں کوئی

پہلے مَیں رابطے میں رہتا تھا
اب کسی کی خبر نہیں کوئی

پاؤں ہیں راستہ نہیں شاہدؔ
ہاتھ ہیں اور ہنر نہیں کوئی



میں جس پیالے میں آبِ حیات پیتا ہوں
ہے اُس پہ لکھا ہُوا کُلُّ مَن علَیھا فَان



ثباتِ نقش کے دعوے تھے سب غلط میرے
کہ سطحِ آب سے غائب ہیں دستخط میرے

اِسی لیے وہاں بارش نہیں ہوئی اب تک
کہ بادلوں کو ملے ہی نہ ہوں گے خط میرے

ہواؤں اور اندھیروں سے جنگ میری تھی
چراغ بھی تو بجھائے گئے فقط میرے

خود اپنے عکس میں ہم شکل مل گیا ورنہ
یہاں کسی سے نہ ملتے تھے خال و خط میرے

بالآخر اِن سے جھلک ہی اُٹھا ہے رنگ ترا
گلاب ہو ہی گئے آئنہ نمط میرے

میں اپنی تختی بھی خوشخط نہ لکھ سکا شاہدؔ
کہ ٹھیک سے نہ لگا تھا قلم کو قط میرے



لے کے جا سکتا ہوں مَیں دونوں طرف
راستہ ہوں، نقشِ پا تو ہوں نہیں

ابھی وہ روشنی ہمراہ تھی، ابھی دن تھا
مگر یہ سلسلہ بھی میری جاں! کوئی دن تھا

بس ایک شام تھی معمول سے بہت ہٹ کر
پھر اُس کے بعد وہی رات تھی، وہی دن تھا

یقین کیجیے اے تازہ واردانِ وقت!
ہمیشہ رات نہیں تھی یہاں، کبھی دن تھا

وہ دن کہ حال شناسوں کے درمیان تھا مَیں
وہی تو میرے لیے سب سے اجنبی دن تھا

خوشی کے بعد غمی تھی، غمی کے بعد خوشی
نہ دائمی کوئی شب تھی نہ دائمی دن تھا

یہ لمحہ گزرے ہوئے لمحے کا تسلسل ہے
لہٰذا وہ جو کئی دن تھے، ایک ہی دن تھا

کسی سے پہلی ملاقات تھی مری شاہدؔ
کسی سے میرے تعلق کا آخری دن تھا

☼

مقامِ شکر نہیں یہ مقامِ توبہ ہے
گری ہے بجلی اگر آپ کے مکان سے دور



میں اپنا آپ اُس گلی کے نام کر نہیں سکا
جہاں کی خاک تھا وہاں خرام کر نہیں سکا

جڑی ہوئی تھی جس جگہ سے میرے دل کی ہر خوشی
زیادہ دیر مَیں وہاں قیام کر نہیں سکا

پتہ بھی تھا کہ رات سر پہ ہے اور اس کے باوجود
میں روشنی کا خاص انتظام کر نہیں سکا

بہت دِنوں سے ذہن منقسم ہے شش جہات میں
اِسی لیے مَیں ایک رخ پہ کام کر نہیں سکا

نہ جانے کیا گرہ زباں میں پڑ گئی تھی اُس گھڑی
وہ سن رہا تھا اور میں کلام کر نہیں سکا



یہ جو تری بزم کی فضا ہے
میرے لیے اجنبی فضا ہے

واضح نہیں ہو رہی کسی پر
کچھ ایسی مِلی جُلی فضا ہے

ناقابلِ شرح ہے یقیناً
دل میں جو گمان کی فضا ہے

نادیدہ و ناشنیدہ دن ہیں
اَن دیکھی اور اَن سنی فضا ہے

یہ جو ہیں کئی فضائیں مجھ میں
دراصل یہ ایک ہی فضا ہے



کر دیا کس نے بے نقاب مجھے
خود سے آنے لگا حجاب مجھے

آخری سانس تک پکاروں گا
کوئی دے یا نہ دے جواب مجھے

ایک مستِ الست جھونکے نے
کر لیا اپنا ہم رکاب مجھے

میں ہوں اک باغِ تہ نشین کا پھول
سو مہکنا ہے زیرِ آب مجھے

آئنہ دارِ عکسِ حیرت ہوں
کھینچے ہے عالمِ غیاب مجھے

پیاس کو کر دیا ہے دریا بُرد
اب ہیں یکساں سراب و آب مجھے

اک ستارے کے نام کرنا ہے
اپنی راتوں کا انتساب مجھے

اک لڑی میں پرونے ہیں شاہدؔ
اپنے اشک اور اپنے خواب مجھے



اب اتنے دن سے جو خود میں سکوت آسا ہوں
نہ جانے کس نئے طوفاں کا پیش خیمہ ہوں

کہیں ہوں اپنے لیے پیش رفت کا ساماں
کہیں مَیں اپنی طرف واپسی کا رستہ ہوں

دکھائی دے تو رہا ہے کوئی الاؤ مجھے
سو تم ذرا یہیں ٹھہرو! مَیں آگ لاتا ہوں

مرے تو ہاتھ میں دیمک لگا عصا بھی نہیں
سمجھ میں آتا نہیں کیسے ایستادہ ہوں

میں زندگی سے لب بالب ہوں آج کل اتنا
کہ اپنے آپ سے باہر چھلکتا پھرتا ہوں

چہار سُو نہ سہی، چلیے اک طرف ہی سہی
میں کائنات میں آخر کہیں تو برپا ہوں

زمیں سے نیچے اتر کر کہیں نہیں جاتا
یہیں سے پورے جہاں کا نظارہ کرتا ہوں

سُنا، سفینہ ڈبویا ہے اور کس کس کا
ہمارے بعد تری ناخدائی کیسی ہے



کہیں دریچہ دریچہ بہار اگر ہے بھی
کہانیوں میں ہے، ایسا دیار اگر ہے بھی

فریبِ چشم ہے جو کچھ دکھائی دیتا ہے
فسونِ گوش ہے، صوتِ ہزار اگر ہے بھی

جو ایک شیشے کی دیوار ہم میں حائل ہے
وہ پایدار نہیں ، پایدار اگر ہے بھی

ہمارے حق میں نہیں، دوسروں کے حق میں ہے
یہاں کی آب وہوا سازگار اگر ہے بھی

برونِ چشم تو منظر کوئی نہیں شاہدؔ
درونِ سینہ ہے، رنگِ بہار اگر ہے بھی



دیر تک پاس بٹھاتا ہے مجھے
ماضی اب حال سناتا ہے مجھے

اب نہیں دیکھتا مَیں خواب کہ اب
خواب خود دیکھنے آتا ہے مجھے

اُس کی آواز مَیں پہچانتا ہوں
یہ کوئی اور بلاتا ہے مجھے

دل تو پھر بھی کہیں لگ جائے گا
رونا تو آنکھ پہ آتا ہے مجھے

جس سے بھی تیرا پتہ پوچھتا ہوں
راہ آگے کی دِکھاتا ہے مجھے



کسی کو عصر فروزی کا اب دماغ نہیں
وگرنہ کون سا پَل ہے جو داغ داغ نہیں

کہاں سے وقت نکالے کوئی کسی کے لیے
کہ اب تو اپنے جھمیلوں سے ہی فراغ نہیں

اندھیرے میں تو دِکھائی بھی مَیں نہیں دیتا
کہ میں چراغ کی تصویر ہوں، چراغ نہیں

عقَب میں آتے ہوؤں نے سمجھ لیا جتنا
ہمارا قافلہ اِتنا تو بے سراغ نہیں

پھلوں میں رس نہیں، پھولوں میں بو نہیں شاہدؔ
مصوری ہے کسی باغ کی یہ باغ نہیں



شش جہت میں یوں ہے اپنا راستہ
دھند میں جیسے کرن کا راستہ

اور بھی ہے اک سفر اندر کہیں
میرے اندر بھی ہے میرا راستہ

جانے کیوں اِس راہ پر چلتے ہوئے
آ رہا ہے یاد پہلا راستہ

خود کو اَن جانے سفر پر بھیج کر
دیکھتے رہتے ہیں اپنا راستہ

اب کوئی میری طرف آتا نہیں
ہو چکا ہوں بھولا بسرا راستہ

پوچھتی ہے آبلہ پائی مری
رہ گیا ہے اور کتنا راستہ

دونوں جانب روشنی کے پیڑ تھے
جگمگا اُٹھا تھا سارا راستہ

بڑھ گیا تھا اور بھی میرا سفر
راستے سے جا ملا تھا راستہ

✡

نہیں شاہدؔ اگر مَیں لا مُتَناہ
میرا پھیلاؤ پھر کہاں تک ہے

✡

پڑھی ہیں جس نے اساطیر عہدِ رفتہ کی
اُسی سے پوچھیے تاثیر عہدِ رفتہ کی

چھلک پڑی ہیں انھیں دیکھ کر مری آنکھیں
ملی ہیں چند تصاویر عہدِ رفتہ کی

کہ اُس زمانے میں رہتے تھے رفتگاں میرے
ہے دل میں اِس لیے توقیر عہدِ رفتہ کی

تم اِس دریچے سے ماضی میں جھانک سکتے ہو
ہمارا حال ہے تفسیر عہدِ رفتہ کی

مجھے تو لمحۂ موجود کا ہے بار بہت
سنبھال آپ ہی جا گیر عہدِ رفتہ کی

کچھ اور ہو گیا ہُوں دور اپنے فردا سے
در آئی حال میں تاخیر عہدِ رفتہ کی

یہیں سے ہو کے پہنچنا ہے اوّلیں پَل تک
کہ رہ گزر ہے ازل گیر عہدِ رفتہ کی

رکی ہوئی ہیں مری سب مسافتیں شاہدؔ
پڑی ہے پاؤں میں زنجیر عہدِ رفتہ کی



تماشا دیکھنے باہر کہیں نہیں جاتا
میں اپنے آئنہ خانے میں دن گزارتا ہوں

یہ ذوقِ دید مرے ساتھ اگر نہیں ہو گا
تو صرف سیر ہی ہو گی، سفر نہیں ہو گا

کبھی میں وقت سے آگے ہوں اور کبھی پیچھے
سو، میرا کام کبھی وقت پر نہیں ہو گا

کچھ اِس لیے بھی توجہ طلب ہوں آپ سے میں
کہ یہ مکالمہ بارِ دگر نہیں ہو گا

کھلے گا کیسے کہ بین السطور کیا کچھ ہے
صحیفہ دل کا جو زیرِ نظر نہیں ہو گا

تم اپنی بھیرویں شاہدؔ عبث الاپتے ہو
یہاں کسی پہ بھی کوئی اثر نہیں ہو گا



آتا ہے زد میں مری، اپنا کنارا مرا
ہے مرا اپنا زیاں موج میں آنا مرا

ایک طرف ہے ازل، ایک طرف ہے ابد
اور کہیں درمیاں سلسلہ تیرا مرا

ایسا ہُوا ہوں دوچار اپنے نتائج سے مَیں
اب تو نہیں یہ بھی یاد، واقعہ کیا تھا مرا

اُٹھ ہی گیا وہ حجاب، جو تھا مرے اُس کے بیچ
ہو ہی گیا آخرش سامنا اُس کا مرا

لفظ تو شاہدؔ کہیں رہ گئے قرطاس پر
رنج ہُوا منتقل سینہ بہ سینہ مرا



سوچتے تھے، جائیں گے کون و مکاں سے کہاں
خواب نے پہنچا دیا ہم کو کہاں سے کہاں

اپنے بدن کے سوا لاکھ ٹھکانے سہی
جائے تو جائے بھلا کوئی یہاں سے کہاں

نیند میں جو ایک راہ ہم کو نظر آئی تھی
جاتی تھی آخر وہ راہ خوابِ رواں سے کہاں

دیکھوں تو آزاد ہوں، سوچوں تو پابند ہوں
نکلا ہوں پوری طرح وہم و گماں سے کہاں

آیا تو تھا مون سون میرے بیابان تک
علم نہیں پھر گیا آگے وہاں سے کہاں

کچھ اِس لیے بھی زمانے سے ہم کو نسبت نئیں
کہ جمع و منع و طمع شیوۂ طریقت نئیں

ہے چند اور سلاسِل کا فیض بھی مرے پاس
میں صرف سلسلۂ خواب ہی میں بیعت نئیں

میں چل رہا ہوں ترے ساتھ جس محبت سے
تو کیا یہ واقعہ اِس دور میں کرامت نئیں!

مشاہدات میں آئی ہیں اور باتیں بھی
مگر بتانے کی مجھ کو ابھی اجازت نئیں

ہماری بزم کا شیوہ ہی اور ہے شاہدؔ
ہم آنے والے کا دِل دیکھتے ہیں، صورت نئیں

میں اپنے دل میں، تو دنیا میں غرق ہے بھائی
فقیر اور گداگر میں فرق ہے بھائی

درونِ سینہ وہ پہلی سی آب و تاب کہاں!
فقط لباس ہی اب زرق برق ہے بھائی

چلو کہ رخ کا تعیّن اُسی پہ چھوڑتے ہیں
وہ جس کے ہاتھ میں سب غرب و شرق ہے بھائی

نظارہ چھوڑا ہے اور اک نظارے کی خاطر
طلب ہے واں کی، یہاں کا جو ترک ہے بھائی

سمے کی لہر تجھے کچھ بتانا چاہتی ہے
مگر تُو اپنی ہی سوچوں میں غرق ہے بھائی



جو روح میں یہ ہری روشنی اُتر جائے
مری بجھی ہُوئی دنیا نکھر نکھر جائے

ندی کے دونوں طرف ایک سے مناظر ہیں
نگاہ چاہے اِدھر جائے یا اُدھر جائے

یہ سوچ کر کبھی نظریں ہٹا بھی لیتا ہوں
مسلسل ایک ہی منظر سے جی نہ بھر جائے

ہَوا چلے نہ چلے لیکن اے گلِ امکاں!
فضاؤں میں تری خوشبو نفوذ کر جائے

ہماری عمرِ رواں ایسے رک گئی ترے بعد
کہ جیسے بہتی ہوئی آب جُو ٹھہر جائے

صراطِ عشق بھی ہے پُل صراط کی صورت
خدا کرے کہ سفر خیر سے گزر جائے



باہر کا تو راستہ وہی ہے
اندر کا سفر بھی کیا وہی ہے

بس لہریں ہی وہ نہیں ہیں ورنہ
لہروں سے مکالمہ وہی ہے

رو پڑتے ہیں تجھ کو یاد کر کے
میں ہوں وہی، دل مرا وہی ہے

موسم کئی آئے بھی، گئے بھی
مجھ میں ابھی تک فضا وہی ہے

بدلا ہے فقط مدار شاہدؔ
گردش ہے وہی، خلا وہی ہے



ہر ایک باب عجب تھا اور انتساب عجب
کھُلی ہوئی تھی مرے سامنے کتاب عجب

عجب مکاں تھا کوئی لامکاں کی سرحد پر
جہاں مقیم تھے کچھ خانماں خراب عجب

وہ دیکھ سکتا تھا مجھ کو، میں دیکھ سکتا نہ تھا
رہا ہے اُس کے مرے درمیاں حجاب عجب

سنائی دیتے نہیں تھے کسی کو میرے سوا
گرج رہے تھے مرے خواب میں سحاب عجب

جو ٹوٹتا نہ کوئی دیر انہماک مرا
تو کھُل بھی سکتے تھے مجھ پر کچھ اور باب عجب



جگنو میں جیسے نور کبھی ہے کبھی نہیں
مجھ میں بھی اک وفور کبھی ہے کبھی نہیں

پلکوں سے بارِ نم نہیں اُٹھتا زیادہ دیر
اِن ٹہنیوں پہ بُور کبھی ہے کبھی نہیں

سَو رخ بدل کے سامنے آتا ہے ایک خواب
آنکھوں کو ہی شعور کبھی ہے کبھی نہیں

اک ایسے منطقے میں سکونت پذیر ہوں
سورج جہاں سے دور کبھی ہے کبھی نہیں

ذہن ارتکاز کھو چکا، اب رہ گیا یہ دل
یہ بھی ترے حضور کبھی ہے کبھی نہیں

عمر کے البم میں تو ہر طرح کی تصویر ہے
لیکن اپنے کام کی بس ایک ہی تصویر ہے

کوئی اچھا سا فریم اِس کے لیے بنواؤں گا
پاس میرے ایک ہی تو قیمتی تصویر ہے

سینری کو سامنے رکھ کر بنائی سینری
اصل جو لگتی ہے وہ تصویر کی تصویر ہے

جانے کس رخ کس نظر سے میں نے دیکھا ہے اسے
ہے پرانی اور لگتا ہے نئی تصویر ہے

اندر اندر فلم سی اک چل رہی ہے اِس گھڑی
سامنے گزرے ہوئے ہر دَور کی تصویر ہے

فقط ہماری تصاویر ہی ادھوری نہیں
تری بنائی ہوئی صورتیں بھی پوری نہیں

سبیل بن تو رہی ہے مگر جو سچ پوچھو
تو اس میں کوئی بھی کوشش مری شعوری نہیں

وگرنہ مجھ پہ یہ محشر کہاں گزرنا تھا
ہزار شکر کہ میری نہاد نوری نہیں

میں آنکھ موند کے اِس کو عبور کر لوں گا
یہ ایک خواب کی دوری تو کوئی دوری نہیں

نبھا سکا ہوں نہ اُس سے نہ اپنے آپ سے میں
کسی طرف سے مری کوئی بات پوری نہیں

دکھائی دیتا ہے جیسا ہماری آنکھوں کو
نظارہ واقعی ویسا ہو یہ ضروری نہیں

نہ جانے کھوئے ہوئے ہیں دل و دماغ کہاں
کئی دنوں سے طبیعت میں وہ حضوری نہیں

☯

روز کہتا ہے میرا دِل مجھ سے
تجھ کو فرصت ملے تو مِل مجھ سے

❁

پہلے دروازہ کھُلا ، پھر گھر کھُلا
پیش منظر سے ہی پس منظر کھُلا

وہ بھلا شرحِ محبت کیا کرے
جس پہ بابِ آرزو دم بھر کھُلا

کچھ سبق ناقابلِ تفہیم تھے
جن کا مطلب حرف سے باہر کھُلا

زندگی نامہ سفر نامہ نہیں
رکھیے سب کے سامنے کیونکر کھُلا

اور بھی رستے تھے شرحِ صدر کے
میرا سینہ اک دعا پڑھ کر کھُلا

دو ہی رخ تھے عشق کی تصویر کے
ایک تجھ پر ، دوسرا مجھ پر کھُلا



فصیلیں بیچ میں حائل ہیں، آپ کیا جانیں
ہوا کے اپنے مسائل ہیں، آپ کیا جانیں

میں سر اُٹھا کے پہاڑوں سے بات کرتا ہوں
جو پستیوں کے فضائل ہیں، آپ کیا جانیں

قدم اُٹھیں گے نہیں آپ کی گلی کی طرف
ہم اور کوچے کے سائل ہیں آپ کیا جانیں

غلط نہ خود کو بھی ثابت کروں تو پھر کہنا
جو میرے پاس دلائل ہیں، آپ کیا جانیں

چراغ والے ہیں شاہدؔ نہ باغ والے ہیں آپ
ہوائیں کیوں کہیں مائل ہیں، آپ کیا جانیں



شام مجھ کو سحر کی طرف لے گئی
ایک دیوار، در کی طرف لے گئی

منزلوں سے نکلتی ہُوئی رہ گزر
اور اک رہ گزر کی طرف لے گئی

تہ کے تھے ہی نہیں، سطح کے لوگ تھے
ناؤ جن کو بھنور کی طرف لے گئی

واپسی بھی اُسی سے ہوئی ہے مری
جو گلی اُس کے گھر کی طرف لے گئی

خواب کی سَمت شاہدؔ روانہ تھا مَیں
بے خیالی خبر کی طرف لے گئی



دن ہے قریب، آخری لمحات کی قسم
سورج یہاں سے دور نہیں رات کی قسم

سو بار تو ملا ہے مگر ایک بار بھی
دیکھا نہیں ہے تجھ کو حجابات کی قسم

تو بھی پرانا ہو گیا مجھ میں پڑے پڑے
تازہ ترین صورتِ حالات کی قسم

پیڑوں کی طرح مجھ پہ رتوں کا اثر کہاں
پت جھڑ میں بھی ہرا ہوں، تضادات کی قسم

وہ دھوپ جس نے پانی سے بادل کیا مجھے
پھر اُس کے ہجر میں ہوں، بخارات کی قسم

احوال وہ نہیں مرے، آثار وہ نہیں
سب کچھ بدل گیا ہے مقامات کی قسم



پہلے سے بڑھ کر کہیں دہکنے لگا ہوں
آگ میں صندل سا مَیں مہکنے لگا ہوں

میں ترے خوابوں سے اور اپنی خبر سے
اتنا لبالب ہوں، اب چھلکنے لگا ہوں

تم نے چھوا ہے تو جان پڑنے لگی ہے
دیکھو! میں پلکیں بھی اب جھپکنے لگا ہوں

پہلے تو تھا ہی نہیں مَیں اُس کی نظر میں
اب کہیں تھوڑا بہت جھلکنے لگا ہوں

اُس کے تغافل سے بجھ گیا تھا میں شاہدؔ
اپنی توجہ سے پھر چمکنے لگا ہوں

کسی کشادہ فضا میں مہک رہا ہوتا
اگر مَیں جسم سے باہر کہیں کھِلا ہوتا

وجود کے مُتَوازی جو ایک دنیا تھی
کبھی اُدھر کا بھی قصدِ سفر کیا ہوتا

بدن کی تنگ فضا میں گزارا تھا ہی نہیں
میں کیوں نہ روح کی وسعت میں پَر کُشا ہوتا

سفر طویل ہُوا راستہ بھٹکنے سے
وگرنہ کب کا مَیں تم تک پہنچ گیا ہوتا

یہ واپسی کا سفر بھی بہ غنیمت ہے
یہ راستہ بھی نہ ہوتا تو جانے کیا ہوتا

ضَو ریز ہوں چاہے جس قدر عکس
ہوتا نہیں دل پذیر ہر عکس

آثار کی اِس طلسم گہ میں
تکرار عجب ہے عکس در عکس

تمثال گروں سے پوچھیے گا
اب کیا ہوئے اُن کے بیش تر عکس

جو نقشہ دِکھایا جا رہا ہے
ہے صورتِ حال اُس کے بر عکس

حیرت بھرے منظروں سے شاہدؔ
درکار ہے مجھ کو آنکھ بھر عکس

جو سنا ہے، وہ سناتا ہوا ہو سکتا ہوں
سلسلہ آگے بڑھاتا ہوا ہو سکتا ہوں

بے توازن نظر آتا ہوں اگر دور سے میں
قدم اپنے میں جماتا ہوا ہو سکتا ہوں

ایک رخ سے جو دکھائی نہیں دیتا ہوں تمھیں
دوسرے سے نظر آتا ہوا ہو سکتا ہوں

یوں تو مامور ہوں گل بوٹے بنانے پہ ہی میں
گل بھی، در پردہ، کھلاتا ہوا ہو سکتا ہوں

فالتو وقت مرے پاس بہت ہے اب کے
میں جسے کام میں لاتا ہوا ہو سکتا ہوں

لگ رہا ہوں جو کماتا ہوا سب کو شاہدؔ
میں کوئی قرض چکاتا ہوا ہو سکتا ہوں

اور اب جو مجھ میں بدن سے گریز پائی ہے
یہ مجھ کو تیری کشش سے نکال سکتی ہے

بدلتی رہتی ہے حالت کے ساتھ ہیئت بھی
خواص ہیں مرے یکساں نہ شکل حتمی ہے

اُسی کی گونج کہیں بہرا کر نہ دے مجھ کو
وہ ایک لَے جو سنائی نہ دینے والی ہے

میں کس دریچے سے دیکھوں تمھاری دنیا کو
کہ دِل کی کھڑکی کسی اور سمت کھلتی ہے

ستارہ وار، بدن گھومتے ہیں روح کے گرد
جہانِ عشق کا اپنا نظامِ شمسی ہے

اک اور سطح پہ صورت پذیر ہے شاہدؔ
دکھ انفرادی ہے میرا نہ اجتماعی ہے



مسئلہ جو کہ بے سبب ہو گا
کچھ زیادہ ہی حل طلب ہو گا

ایک پرچھائیں ہو گی روز بہ روز
جس کا پھیلاؤ شب بہ شب ہو گا

طے بھی ہو گا تو بے خیالی میں
خواب کا راستہ عجب ہو گا

سوچتا ہوں کہ میرے ہونے کا
کچھ سبب ہوگا، کیا سبب ہوگا

وصل ٹھہرا ہے روز و شب سے اُدھر
وقت کا اختتام کب ہو گا



بیان خود کو کروں بے خودی کے پردے میں
کسی کی بات کروں مَیں کسی کے پردے میں

سمٹ کے بیٹھ رہا وہ درونِ حرف کہیں
میں اُس کو سامنے لایا اُسی کے پردے میں

جو لے گیا مجھے بے رنگی کی طرف آخر
اک ایسا رنگ بھی تھا روشنی کے پردے میں

کہیں مَیں سارے حجابات چاک کرتا ہُوا
کہیں چھپا ہوا اپنی کمی کے پردے میں

بیان ہو گیا دل کا لہو لہو ہونا
شفق سی کِھل اُٹھی منظر کشی کے پردے میں

وہ کوئی اور نہیں تھا، مَیں آپ تھا شاہدؔ
جو ہم کلام تھا مجھ سے دوئی کے پردے میں



سخت مشکل گھڑی کا سامنا ہے
آج پھر زندگی کا سامنا ہے

آج اک آئنے کے سامنے ہوں
اور اپنی کمی کا سامنا ہے

وہ مرے روبہ رو ہے، میں اُس کے
ہر کسی کو کسی کا سامنا ہے

چھپتا پھرتا تھا جس نگاہ سے مَیں
آخرِ کار اُسی کا سامنا ہے

غیب سے کب کا مَیں گزر آیا
اب تو موجودگی کا سامنا ہے

اک طرف لامکانی ہے درپیش
اک طرف بے گھری کا سامنا ہے

پس پردہ بھی، پیشِ پردہ بھی
مجھ کو شاہدؔ مجھی کا سامنا ہے



کرچیاں چُنتے ہوئے سوچ رہا ہوں شاہدؔ
شیشہ گر ہو کے اُٹھائے ہیں خسارے کیا کیا

سحر کی آس میں با چشمِ نم پڑے ہوئے ہیں
عجیب شب کدہ ہے جس میں ہم پڑے ہوئے ہیں

پڑی ہیں ایک طرف دل کی حسرتیں مجھ میں
اور اک طرف کہیں دنیا کے غم پڑے ہوئے ہیں

ضرور میرا جھکاؤ کسی طرف ہو گا
یونہی تو مجھ میں نہیں اِتنے خم پڑے ہوئے ہیں

اور اب نہ اِس سے سروکار ہے نہ اُس سے مجھے
یہ پیش و پس جو وجود و عدم پڑے ہوئے ہیں

اِدھر اُدھر کے ہیں کتنے ہی سلسلے شاہدؔ
جو اِن دنوں مرے اندر بہم پڑے ہوئے ہیں

لایا ہوں میں ترے لیے تارے سجا کے طشت میں
اشکوں کے سارے رنگ ہیں خواب کی سرگزشت میں

پھرتا ہوں سر پہ اوڑھ کر ایک فضائے نیلگوں
تیرے خیال و خواب کے گہرے سنہرے دشت میں

گرمِ سفر تھا جب بدن، جادۂ آب و خاک پر
محو تھی روح اُس گھڑی اور ہی سیر و گشت میں

جانیے کس مقام سے میں نے پکارا ہے تجھے
ڈوب گئی مری صدا اپنی ہی بازگشت میں

جب سارا شہر خواب کی دنیا میں محو تھا
اُس وقت بھی میں تیری تمنا میں محو تھا

کھویا ہوا تھا جب ترے حسن و جمال میں
میں اور بھی کہیں اُسی اثنا میں محو تھا

اپنی طرف کسی کی نظر ہی نہیں گئی
جو تھا وہاں، وہ اپنے علاوہ میں محو تھا

بینائی کب بجھی یہ خبر ہی نہیں ہوئی
ایسا میں روشنی کے سراپا میں محو تھا

بالا تھی میرے فہم سے معدوم کی کشش
آخر مَیں کیوں مناظرِ رفتہ میں محو تھا

پہلا سا ارتکاز کہاں تھا کسی طرف
ذہن ایک وقت میں کئی اشیا میں محو تھا

دنیا کی ہستی کھیل تماشا ہی تھی اگر
پھر کس لیے میں کاوشِ دنیا میں محو تھا

شاہدؔ کوئی صدا مجھے باہر نہ لا سکی
ایسا مَیں اپنے شورِ تماشا میں محو تھا

تم بھی آنا کہ میرے خوابوں کی
آج تقریبِ رُونمائی ہے



وہ اک فضا جو نظر پار جھلملاتی تھی
نہ جانے کیوں مجھے اپنی طرف بلاتی تھی

میں جانے کس سے ملاقات کرنے جاتا تھا
یہ کائنات مرے راستے میں آتی تھی

ہزاروں خس کدے جس آگ کی لپیٹ میں تھے
وہ میری موجِ نفَس سے فروغ پاتی تھی

نہ جانے کیسے مجھے اِتنا آگے لے آئی
وہ رہ گزر جو بظاہر کہیں نہ جاتی تھی

عجب شبیہ تھی دل کے نواح میں شاہدؔ
نظر میں آتی تھی، پہچان میں نہ آتی تھی



جب اُس دیارِ نور سے رخصت ہوا تھا میں
مڑ مڑ کے روشنی کی طرف دیکھتا تھا میں

اپنی جگہ شبیہ نظر آتی تھی تری
آئینہ دیکھتا نہیں تھا، چومتا تھا میں

جانے کدھر سے آیا تھا جھونکا نشاط کا
یک بارا پنے آپ میں کھل سا اُٹھا تھا میں

کوئی تو آ گیا تھا مرے اُس کے درمیاں
یونہی کب اپنے آپ میں گہنا گیا تھا میں

کل تک تو خود سے میرے تقاضے ہزار تھے
اور آج اپنے سامنے بے مُدّعا تھا میں

شاہدؔ مری خوشی کا ٹھکانہ کوئی نہ تھا
اک عمر بعد اُس کی طرف جا رہا تھا میں

لاسَمتی ہے صد جہات میری
گمبھیر ہیں کیفیات میری

اب نیند ہے جاگنے سے بڑھ کر
دن سے ہے طویل رات میری

بے منظر و بے مکالمہ ہے
تمثیلِ تعلقات میری

سب راہیں لپیٹ دی گئی ہیں
اب چال ہے بے بساط میری

گھٹ جائے نہ رسم و راہ دل سے
بڑھ جائیں نہ مشکلات میری

میں اِس لیے ہجوم کا حصہ نہیں بنا
سورج کبھی نجوم کا حصہ نہیں بنا

میرا الگ سماج ہے، میرا الگ مزاج
میں محفلوں کی دھوم کا حصہ نہیں بنا

بادِ سحر ہوں اپنے ضمیر و خمیر میں
اِس واسطے سموم کا حصہ نہیں بنا

موجِ خفی ہوں، سینہ بہ سینہ ہے میرا فیض
میں ظاہری علوم کا حصہ نہیں بنا

شاہدؔ میں اِس سماج کا حصہ ضرور ہوں
لیکن غلط رسوم کا حصہ نہیں بنا